TAMSAAL
تمثال
Vol 2, Issue 2 Julu-De,2023
www.tamsaal.pk
tamsaalurdu@gmail.com

پروفیسر خلیل قدوس
گورنمنٹ کالج باغ،آزاد کشمیر

فضل احمد خسرو کی شاعری میں رمزیت وایمائیت

Professor Khalil Quddus
Government College Bagh, Azad Kashmir

Symbolism And Emaism In The Poetry Of Fazl Ahmad Khusro

Plato's name comes first in the discussion of literature. This famous Greek philosopher. In the history of human thought, knowledge is considered to be the teacher, leader and commentator. Plato openly discusses this in his famous treatise, Democracy. According to Plato's concept, there are two worlds. One that is real and eternal. In which there can be no change. This is the world of ideas or the world of example. The other one is the manifestation of appearance, change and time. This is the world of senses. Everything in the second world is a copy of some concept of the first world, and therefore better than it. The poet depicts the objects and events of this temporary world. That is, it copies. But this world and its objects are themselves copies of the universal example. So literature is a copy of a copy. Aristotle was the first thinker who established some purely aesthetic principles in this regard. Such a definition of nothing is possible. Which completely covers all the beauty and victory of anything, the same is the case with literature. What is literature? This question is as important today as it was before Plato. It is said that art is related to beauty. Performing any work well is called art. And art leads to the satisfaction of good taste in man. Among the many blessings that God has blessed man with, prayer is the most important. Which creates gentleness, civility, politeness and kindness in human nature. On the other hand, immunity and competition are necessary for survival. In order to live life and overcome resistances, there are also anger and anger, honor and humility in man.

Keywords: human nature, gentleness, some purely aesthetic, first thinker

کلیدی الفاظ: افلاطون،۔ ارسطو،میں ذوق سلیم، غیض و غضب

ادب کی بحث میں سب سے پہلے افلاطون کا نام آتا ہے۔ یونان کا یہ نامور فلسفی۔ فکر انسانی کی تاریخ میں علم و دانش کا معلم رہنما اور شارح خیال کیا جاتا ہے۔ افلاطون نے اپنی مشہورعالم کتاب ، جمہوریت کے حصہ دہم میں اس پر کھل کربحث کی ہے۔ افلاطون کے تصور کے مطابق عالم دو ہیں۔ ایک وہ جو حقیقی اور ابدی ہے ۔ جس میں کوئی تغیر نہیں ہو سکتا۔ یہ عالم تصورات یا عالم مثال ہے دوسرا وہ جو نمود، تغیر اور زمان کا مظہر ہے یہ عالم حواس ہے۔ دوسرے عالم کی ہر شے پہلے عالم کے کسی تصور کی نقل ہے، لہذا اس سے بہتر ہے۔ شاعر اس عارضی دنیا کی اشیاء اور واقعات کی تصویر کشی کرتا ہے۔ یعنی نقل کرتا ہے۔ لیکن یہ دنیا اور اس کی اشیاء تو بذات خود عالم مثال کی نقل ہیں۔ لہذا ادب نقل کی نقل ہے۔ ارسطو پہلا مفکر تھا جس نے اس ضمن میں چند خالصتا جمالیاتی اصول قائم کئے ۔کسی چیز کی ایسی تعریف ممکن نہیں ہے۔ جو کسی بھی چیز کے تمام حسن و فتح کا مکمل احاطہ کر لے یہی حال ادب کا بھی ہے۔ ادب کیا ہے؟ یہ سوال آج بھی اتنا ہی اہم ہے جتنا افلاطون سے پہلے تھا۔ کہا جاتا ہے کہ فن کا تعلق حسن سے ہے۔ کسی بھی کام کو احسن طریقے سے سرانجام دینا فن کہلاتا ہے۔ اور فن انسان میں ذوق سلیم کی تسکین کا باعث بنتا ہے۔خدا نے انسان کو جتنے

داعیات سے نوازا ہے اُن میں سے اہم داعیہ ہے۔ جو انسانی فطرت میں نرمی ، تہذیب علم ، شائستگی اور گداز پیدا کرتا ہے۔ دوسری طرف زندہ رہنے کے لیے مدافعت اور مقابلہ ضروری ہے۔ زندگی بسر کرنے اور مزاحمتوں پر قابو پانے کے لیے انسان میں غیض و غضب ، غیرت و حمیت کے دائیے بھی موجود ہیں۔ ان داعیان کو قابو میں رکھنے کے لیے ذوق سلیم اور ذوق جمال کی افزائش کی حامل لطیف محسوسات کا ہونا از بس ضروری ہے۔ ان محسوسات کے بغیر انسانی زندگی جبر وانتشار سے عبارت ہو کر رہ جائے گی ۔ ادب انسانی زندگی کے توازن کو برقرار رکھنے میں بہت مددگار ثابت ہوتا ہے۔اور اُسے انسانیت، تہذیب اور شائستگی کی جانب مائل کرتا ہے۔

افلاطون نے مطالعہ فن اور مطالعہ اخلاق کو ایک چیز قرار دیا تھا۔ لیکن ارسطو نے دونوں میں امتیاز کر کے اس ضمن میں جمالیات کی بنیا د رکھی ۔ ارسطو کے نزدیک برفن پارہ چاہیے وہ نظم ہو یا تصویر ایک حسین شے ہے۔ اس سے ایک خاص قسم کی مسرت حاصل ہوتی ہے۔وہ کہتا ہے کہ " : جب ہم کسی نظم کو اچھا کہتے ہیں تو اس سے مراد نظم کا حسن ہوتا ہے۔ یعنی لفظ اچھا اخلاقی معنی میں نہیں بلکہ جمالیاتی معنی میں استعمال ہوتا ہے " (1)

ارسطو کے بعد ادب کے بارے میں مختلف خیالات زیر بحث آتے رہے اور یہ بحث اب تک جاری ہے ۔ اس ضمن میں سب سے اہم نام لون جائی نس کا ہے جس کا تعلق غالبا تیسری صدی عیسوی سےہے ۔ لون جائی نس یونانی روایت سے برادر است مشاتر تھا۔ لون جائی نس اپنے مشہور زمانہ نا تمام رسالے ‘On the Sublime’ " میں ارسطو کے اس خیال سے متفق نظر آتا ہے کہ :ادب مسرت اور حظ کا ذریعہ ہے ۔لون جائی نس کے بقول

"ادب وہ ہے جس سے قاری یا سننے والے پر وجد طاری ہو جائے اوراس اثر کی وجہ سے اس میں پاکیزہ جذبات و خیالات بھی ہوتے ہیں اور اسلوب ایسا ہوتا ہے۔ جس میں وہ جذ بے اچھی طرح رچے بسے ہوتے ہیں "۲

اس سلسلہ کا تیسرا بڑا نام جن کا تعلق سولہویں صدی سے ہے وہ ہیں سرفاپ سڈنی اُن کے بقول :

"ادب ایک تہذیبی اور اصلاحی سلسلہ عمل ہے "۳

سڈنی ادب و شاعری کومحض علم و حقائق کا بیان قرار نہیں دیتا بلکہ ایسابیان سمجھتا ہے جس میں جذبے کا جوش بھی ہو اور تخیلی اختراع کی مدد سے اس میں کہانی اور افسانے کا سارنگ پیدا ہو جائے ۔ وہ صاف صاف کہتا ہے کہ کم شاعری یافن اسی صورت وقیع ہو گا کہ اس سے نیکی اور اخلاق کو فروغ حاصل ہو سکے۔ نشاۃ الثانیہ کے زیر اثر یورپ میں عام بیداری پیدا ہوئی۔ قدیم اسالیب اور روایات سے آزادی نصیب ہوئی اور علم وفن کو بڑا فروغ حاصل ہوا مگر اس آزادی کے ساتھ ساتھ افراتفری بھی پیدا ہوئی۔ بن جانس نے اس ابتری کو دور کر کے قدیم کلاسیکی نظم و ضبط کو بحال کرنے کی کوشش کی۔ سڈنی کے ایک سو سال بعد ڈ رائیڈن جو خود بھی بلند پایہ شاعر تھانے ادب و شاعری کی ماہیت کی دوسرے طریقے سے تشریح کی اور ڈرامائی شاعری کو متعارف کروایا۔ ارسکن لکھتا ہے کہ ادب کی تخلیق محض تفریح کے لیے نہیں بلکہ ان کا ایک مقصد بھی ہے ۔ سنجیدہ مقصد اور منصب شرافتوں کی تلقین و تعلیم ۔ ماہرین ۔۔۔ادب کیلئے ضروری سمجھتے ہیں کہ اس میں قلبی واردات اور ذہنی کیفیات کو پیش کیا جائے ۔ آگے چل کر " روح تنقید " میں لکھتے ہیں۔

ادب کا بہترین اور اعلیٰ نمونہ وہی ہے جس میں کائنات پر روشنی ڈالی گئی ہے ادب کاحقیقی اور آخری مقصد بے شک صداقت اور اخلاقیات ہے لیکن عملی ظاہری معنوی اور استدلالی نہیں بلکہ اصولی اور حقیقی۔ ۴

مجنوں گورکھپوری نے ادب کے مقصدی ہونے پر ادب اور زندگی میں تفصیل سے لکھا ہے، وہ لکھتے ہیں :

ادب بھی ہماری معاشی اور سماجی زندگی سے اسی طرح متاثر ہوتا ہے جس طرح ہمارے دوسرے حرکات و سکنات فنون لطیفہ یا مخصوص ادبیات کسی نہ کسی حد تک قوموں کے عروج وزوال کا آئینہ ضرور ہوتے ہیں "۵

ڈاکٹر اختر حسین رائے کے نزدیک :

"ادب کی تخلیق کا مقصد محض انبساط ، تفریح طبع یا احساس جمال کو تسکین دینا نہیں ہے۔ اُنھیں ٹالسٹائے کے اس خیال سے اتفاق ہے کہ ادب اور آرٹ کا کام انسان کے جذبات کو متاثر کرنا ہے ۔ لیکن ان کے خیال میںادب کی نوعیت سماجی ہونی چاہیے "٦

اختشام حسین بھی ادب کے مقصد کے سلسلہ میں اخت ر حسین کے ہم خیال ہیں۔ لکھتے ہیں

ادب کا مقصد اجتماعی ہے ادب برائے ادب نہیں ‘‘

ایک اور جگہ اسی خیال کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے :

ادب کو انفرادی نہیں اجتماعی خواہشات اور صحت بخش تصورات کا آئینہ ہونا چاہیے "٧

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ادب میں شاعری کا مقام کیا ہے۔ یہ سوال اتنا ہی اہم ہے جتنا یہ سوال کہ کیا احاطہ تحریر میں آیا ہر خیال ادب ہے کہ نہیں ؟ جس طرح موخر الذکر کے بارے میں کئی طرح کے جوابات ممکن ہیں اسی طرح اول الذکر کے بارے میں مشرق و مغرب کے ہر دور میں مختلف قسم کے نظریات بنتے اور بدلتے رہے ہیں۔ حالات کے بدلنے کے ساتھ ساتھ شعر و شاعری نقالی کے منصب اور مقصدمیں تبدیلی ہوتی رہی ہے۔ افلاطون نے شاعری کو نقالی اور شاعر کو نقال کہا ہے جو جنون اور دیوانگی کے زیر اثر کذب ، در دورنج اور فرضیت کوبڑھاوا دیتا ہے۔ افلاطون ایک فلسفی تھا اس لیے وہ شاعری کوایک فلسفی کی نظر سے دیکھتا ہے۔ ارسطو پہلا مفکر تھا جس نے ادب و شعر کی بنیادی خصوصیات کا تجزیہ کیا اور یہ دکھانے کی کوشش کی کہ یہ ایک سنجیدہ اور مفید عمل ہے ۔ یہ لغو اور خطر ناک نہیں جیسا کہ افلاطون نے کہا ہے ۔ شاعری کے بارے میں ارسطو کہتا ہے۔ شاعر کا طریق اظہار انوکھا اور موثر ہوتا ہے وہ اس نشے کی تخلیق کرتا ہے جسے حسن کہتے ہیں حسن ایک صورت ، ایک ہیت کا متقاضی ہوتا ہے شاعر اور فنکار کا کمال یہ ہے کہ وہ ہمیں علم ہی نہیں دیتا بلکہ ہیت کے حسن سے محظوظ بھی کرتا ہے۔ لون جائنس ارسطوکے اس خیال سے متفق نظر آتا ہے کہ شعر و ادب حظ اور مسرت کا ذریعہ ہیں۔اس کے خیال میں شاعری ادب کا وہ حصہ ہے جو قاری پر سب سے زیادہ اثر انداز ہوتی ہے۔ یہ ادبکے جملہ خصائص کی جامع صفت ہے اور خیالات کا شرف اور اسلوب کا شکوہ اس میں بطور اجزا شامل ہیں۔

سڈنی کے نظریہ شاعری کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ وہ پیورٹن گروہ کے اعتراضات کےجوابات پر ہے۔ بہر حال وہ کہتا ہے شاعری ایک قدیم فن ہے اس کی قدامت اس کے جواز کی دلیل ہے۔ ہر دور میں انسانوں کا اس کی طرف توجہ دنیا اس بات کا ثبوت ہے کہ اس کا تعلق انسان فطرت اولی سے ہے۔ شاعری ایک تہذیبی اور اصلاحی عمل ہے۔ قدیم ترین فلسفی اور سائنس دان حقائق علمیہ اور معارف کلیمہ کے لیے شاعری کو ذریعہ اظہار بناتے رہے ۔ یہاں یہ بات مد نظر رہنی چاہیے کہ سڈنی شاعری کو محض حقائق بیان کرنے کا ذریعہ ہی نہیں سمجھتا بلکہ ایسابیان سمجھتا ہے جس میں جذبے کا جوش بھی ہواور تخیلی اختراع کی مدد سے اس میں کہانی اور افسانے جیسا رنگ بھی پیدا ہو جائے۔ سڈنی کے نزدیک شاعری صرف وزن اور بحر کا نام نہیں ہے بلکہ تخلیق اور اختراع کا نام ہے۔ شاعری صرف نقل نہیں ہے بلکہ یہ ایک جہان نو ہے جو شاعر کے تخیل سے تشکیل پاتا ہے۔ یہ ایک ایسی دنیا ہے جو اس مرکی اور خارجی کائنات سے خوب تر ہوتی ہے۔سڈنی کے ایک سو سال بعد ڈرائیڈن نے شاعری کی ماہیت کی اور طرح تشریح کی اور ڈرامائی شاعری کو نفس انسانی کی دلکش اور فرحت بخش تصویر یا نقش قرار دیا۔

جانسن شاعری کو نفس عامہ انسان کی بازگوئی یا باز آفرینی قرار دیتا ہے۔ ورڈزورتھ کے نظریہ شاعری کو دیکھنے سے پہلے ہم اُس کا انسان اور فطرت سے ہم آہنگی کا نظریہ دیکھتے ہیں۔ اس کے نزدیک شاعر کا کمال یا عطیہ یہ ہے کہ وہ قلب انسا نی اور روح فطرت کی ہم آہنگی کو منکشف کرتا ہے اور اس ہم آہنگی کے اصول کو تصویروں اور لفظی پیکروں کی صورت میں پیش کرتا ہے اس کے نزدیک انسان اور فطرت دونوں ایک دوسرے کے راز دار اور محرم ہیں ۔ وہ مزید کہتا ہے :

انسانی دماغ) یا قلب (تجلیات فطرت کا آئینہ ہے "٨

انسان اور فطرت کی باہمی محبت اور ان دونوں کا ربط شاعری کا موضوع ہے اور اس سے وہ مسرت پیدا ہوتی ہے جو شاعری سے مخصوص ہے۔ ورڈزورتھ کے نزدیک شاعری فطرت انسانی اور فطرت کا ئنات دونوں کے کوائف اور اصولوں سے آگاہ کرتی ہے۔ اور اس کی فضیلت یہ ہے کہ علم اور آگاہی کے ساتھ ساتھ غم اور مسرت کا عصر بھی اس میں شامل ہے۔ " شیلے کے نزدیک شاعری بہترین دماغوں اور دلوں کے مسرت سے بھر پور ہے شیلے مزید کہتا ہے :

لمحوں کی روداد ہے "۹

"شاعری ایک ہنر اور اُلوہی چیز ہے شاعری علم و عرفان پر محیط ہے اور اس کا مرکز بھی ہے .۱۰

شیلے کی تعریف کو اگر دیکھا جائے تو صاف نظر آتا ہے کہ شیلے کے نزدیک شاعری کے دو مقاصد نظر آتے ہیں۔ یہ کہ یہ مسرت حیات اور دانش کے لیے نیا مواد مہیا کرتی ہے ۔ دوسرا یہ کہ وہ ایک ایسا حسن نظم کے پردے پر لاتی ہے جسے ہم حسن و خیر کی محسوس اور خارجی شکل قرار دیتے ہیں"۱۱

جان رسکن عہد وکٹوریہ کی اخلاقیات کا علمبر دار مصنف اور اس دور کے متوسط طبقے کے اجتماعی آداب کا محافظ اور ناقد تھا۔ رسکن فن اور اخلاق کو ایک وحدت کے طور پر دیکھتا ہے۔ رسکن کہتا ہے۔

"شاعری محض تفریح کے لیے نہیں ہے۔ ان کا ایک سنجیدہ مقصد بھی ہے۔ اس لیے فنکار یا تو اس سے دست کش ہو جائیں یا اس سے صحیح واسطہ رکھیں "۱۲

مندرجہ بالا تمام بحث سے یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ فن کوئی بھی ہو سماج سے جڑاہوا ہے۔ جس طرح سماج کے افراد کے رجحانات ہمیشہ ایک سے نہیں رہتے۔ اسی طرح من جملہ شاعری کے تمام فنون لطیفہ کے شعبوں میں بے پناہ تغیر واقع ہوا ہے۔ جب بھی سماج انقلاب سے دوچار ہوا ہے۔ جب بھی حالات نے نئی کروٹ بدلی، جب بھی زندگی کسی نئے موڑ پر آتی ہے اور فکر و خیال کی بہتی ہوئی ندی کا دھارا موڑ کر کوئی نیارخ اختیار کرتی ہے۔ فنون لطیف بھی اپنے اندر انقلاب کی کیفیت پیدا کرنے کے لیے مجبور ہو جاتا ہے۔

دوسرے فنون لطیفہ کی طرح شاعری کا بھی یہی حال ہے کہ وہ ہمیشہ ایک حالت میں نہیں رہ سکتی ۔ اس میں بھی ساتی تغیرات کے ساتھ ساتھ صوری و معنوی دونوں اعتبار سے تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں ۔ اس نے بدلتی ہوئی دنیاکے تمام اثرات قبول کئے ہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ ایک خاص دور کی شاعری دوسرے دور کی شاعری سے مختلف نظر آتی ہے۔ مثال کے طور پر اردو شاعری میں ایک دور تک غزل کا دور رہا جس کی **بیت** چند خاص قسم کے خیالات ہی کی متحمل ہوسکتی ہے اور پھر چند شاعروں نے داخلیت سے متاثر ہو کر خار جیت میں پناہ لی اس طرح شاعری کی دوسری اصناف سخن کو اپنانے پر مجبور ہوئے۔

ان تمام انفرادی کوششوں کو چھوڑ کر اگر ہم اجتماعی طور پر دیکھیں تب بھی ہمیں اُردو شاعری کے اندر ہئیت کے اعتبار سے خاصا تنوع نظر آتا ہے۔ ایک طرف اس میں غزل ہے تو دوسری طرف نظم کہیں مثلث ہے تو کہیں مسدس کہیں مخمس ہے تو کہیں مثنوی کہیں ترکیب بند اور ترجیع بند غرض یہ تمام اصناف سخن ہیں جو خیالات کی مناسبت سے استعمال کی جاتی ہیں ۔ ہئیت کی یہ تبدیلیاں جن کا اوپر ذکر ہوا ہے بہت معمولی ہی تبدیلیاں تھیں لیکن جہاں تک ان کے وقت اور ماحول کے پس منظر کا تعلق ہے وہ بعض حیثیتوں سے اہم ضرور ہیں لیکن اس سے قطع نظر ہماری شاعری میں 1857ء کے انقلاب کے بعد اور صوری اور معنوی اعتبار سے جو تغیر ہوا وہ ہی انقلاب انگیز ہے۔ اس دور میں حالی اور آزاد نے نے اپنی شاعری پیش کی۔ اُنہوں نے چند ایسی نظمیں لکھ دیں جن کا موضوع مثنوی سے مختلف تھا مثنوی کے اس استعمال نے اُردو شاعری کو اس صنف سخن سے روشناس کروایا جس کو آج ہم نظم کہتے ہیں ۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ نظم کی اگر سیدھے سادے الفاظ میں تعریف کرنا چاہیں تو کیا ہوگی تو اس ضمن میں کہا جاسکتا ہے کہ لفظوں کا وہ مجموعہ جس میں موزونیت کی صفت پائی جائے مصرعہ کہلاتا ہے اور مصرعوں کا وہ مجموعہ جس میں فکری تسلسل یا معنوی ربط پایا جائے وہ نظم کہلاتاہے۔ چونکہ نظم میں کسی خاص انداز یا ہنیت کی پابندی ضروری نہیں ہوتی اور اس کے لیے قافیہ ردیف کی پابندی

بھی ضروری نہیں ہوتی اور غزل کے برعکس خیالات میں ایک تسلسل بھی پایا جاتا ہے اس لیے نظم کا دامن غزل کی نسبت کہیں زیادہ وسیع اور کشادہ ہو جاتا ہے۔ فنی لوازم کی قید کم ہونے کی وجہ سے ایک شاعر اپنے فکر ونظر کی رفعتوں اور وسعتوں کو نظم میں بخوبی بیان کر سکتا ہے۔ نظم میں کسی بھی موضوع پر فصاحت کے ساتھ لکھا جا سکتا ہے۔ البتہ اس تسلسل خیالی ضروری ہے۔ وقتی موضوعات ، ہنگامی حالات، واردات قلبی ، دینی نظریات کا اظہار موسم کی رعنائیاں ، فلسفیانہ موشگافیاں نفسانی کیفیات غرضیکہ ہر قسم کے موضوعات نظم کے دامن میں سموئے جا سکتے ہیں ۔ اس طرح لنظم مذاق عام کی تر جمان بن جاتی ہے۔ شاعر ردیف اور قافیہ کی قید سے آزاد ہوتا ہےاس لیے وہ اپنے تخیل کو مناسب ترین الفاظ کا جامہ پہنائے چلا جاتا ہے۔ موجودہ دور میں تعلیم کی فراوانی بین الاقوامی تعلیمات اور سائنسی آلات نے فکر میں تبدیلی پیدا کیاور اس سے شاعر کے تخیل میں وسعت پیدا ہوئی۔ اس سے نظم میں مزید وسعت پیدا ہوئی جس سے نظم میں سیاست معیشت ہذیب معاشرت اور سماج کے تمام پہلوؤں کو نظم میں بیان کیا جانے لگا۔

فضل احمد خسرو نے موجودہ دور کی جدیدیت اور ترقی پسند شعراء کی کمزوری کو نہیں اپنا یا ان کے ہاں ن۔م راشد کی طرح آزاد نظم تو ملی ہے۔ مگر اجنبیت اس رنگ میں نظر نہیں آتی۔ فضل احمد سرو نے قدیم روایات سے بغاوت تو کی مگر انی سے اپنا تعلق قائم رکھا۔ ان کے ہاں نفسگی پائی جاتی ہے اور وی سوز جو کلا سیک اساتذہ اکرام کا خاصہ ہے۔ ان کے اں نظم میں تسلسل خیال ہے۔ فضل احد خس و بنیادی طور پر غزل گوشاعرہے مگر وہ نظم کے ساتھ پورا پورا انصاف کرتا نظر آتا ہے۔ ان کی نظموں ے اشعارز نجیر کی کڑیوں کی طرح مربوط ہوتے ہیں۔

زندگی جہد مسلسل

خسر وزندگی کاشاعر ہے ایساشاعر جس نے زندگی کو بہت قریب سے بھوگا ہو اور زندگی نے جس سے لحہ لحہ کا خراج قطرہ قطرہ کر کے نچوڑا ہے۔ وہ زندگی کو صرف سانس لینےکے عمل ہی سے تعبیر نہیں کرتا بلکہ جس کے نزدیک زندگی نام ہے۔ د مسلسل کا درد کے ایک نہ ٹوٹنے والے سلسلہ کا۔ وہ اپنے آپ کو پسماندہ طبقہ کا ایک فرد سمجھتا ہے اور حالات کو اُسی نظر ایک جہدِ سے دیکھتا ہے۔ شاعر زندگی کامشاہدہ باہر کھڑے ہوئے ایک تماشائی کی طرح نہیں کرتا بلکہ سنگین حقائق کی خارجی دنیا کے سمندر میں غوطہ زن ہو کر گو ہر مراد پانے کی سعی کرتا ہے۔ خارجی امکانات کی ایک ایسی دنیا جو دردناک اور سفاک ہے۔ وہ زندگی کے اس چیلنج کو قبول کرتا ہے۔ وہ حالات کی ستم ظریفی کو تقدیر الہی سمجھ کر قبول کر لینے پر تیار نہیں ہے۔ اُس کا وجدان اس سارے دکھ درد اور ابتلا کے پیچھے چھپے عناصرکا پردہ چاک کر کےاُسے حقیقی تصویر دکھاتا ہے تو وہ بے اختیار پکار اُٹھتا ہے :

اہل حرص و ہوا لوٹ کر لے گئے
اس ہوس کار ماحول کی آگ میں
میرا باغ بدن جل بجھا شل ہوا
میری محنت مشقت کا سارا ثمر

یہاں شاعر یا تو یاسیت اور قنوطیت کا شکار ہوکر ایک گہرے احساس محرومی اوراحساس کمتری کی کھائی میں جا گرتایا خم ٹھونک کر حالات کو بدلنے کی روش اختیار کرتا مگر خسرو دوسرے راستے پر چلتا نظر آتا ہے۔ وہ شکستہ تین تو ہے مگر شکست تسلیم کرنےپر تیار نہیں ہے۔ شدید بحرانی حالات اس میں اتنا ہی شدید ردعمل پیدا کرتے ہیں ۔ایسےمیں وہ سامراج کو ایک بچے سپاہی کی طرح للکار تا نظر آتا ہے۔

آج توآج ہے
آج ماضی نہیں
مجھے کو دیکھو گے تم اک نئے رنگ میں
کہ مقابل ہوں میں آج سے جنگ میں

اس آہنگ میں نظم کہتے ہوئے وہ اپنے پیش رو ۔م راشد کی طرح ایک گہری یا سیت کا شکار بھی نظر آتا ہے مگر یہ یاسیت مایوسی اُس جذبہ جہد سے شکست کھاتے ہوئے نظر آتی ہے جو خسرو کی نظم میں جا بجا بکھر اپڑا ہے اور وہ ایک عملی شخص کی طرح پھر عمل مسلسل پر کمر بستہ نظر آتا ہے :

کیااس کو کہتے ہیں جینا

آہیں بھرنا آنسو پینا

بغاوت اور انقلاب ان دولفظوں کو پھیلانے میں جوش کا بڑا ہاتھ ہے اور اسی لیے وہ شاعر انقلاب بھی کہلاتے ہیں اور سامراجیت سے دشمنی اور انقلاب کی جو روایات جوش کے توسط سے اُردو شاعری میں آئیں۔ وہ خسرو کے ہاں زیادہ تو انا شکل میں موجود ہیں ۔ جوش بنیادی طور پر ایک رومانیت پسند شاعر ہیں۔ اس لیے اُن کے انقلاب کا تصور بھی رومانی ہی ہے۔ جس کے زیر اثر وہ بہت جلد مشتعل ہو کر جذبات اور ہیجان کے طوفان میں بہہ جاتے ہیں ۔ اصل میں ان کی رومانی فطرت انہیں جلد بازی کی ترغیب دیتی ہے۔ رومانویت بھری جلد بازی اور انقلابی روح سے لبریز سامراجیت دشمنی کی یہی روایت خسرو کے ہاں دیکھئے :

شرف بشر کا نور لڑائی

جلوہ کوہ طور لڑائی

حق کا ہے منشور لڑائی

سرمد اور منصور لڑائی

سامراجیت سے دشمنی اور سرمایہ دارانہ نظام سے نفرت جو اشتراکیت کے فلسفہ سے متاثر ہونے کی وجہ سے ہے

صاف صاف دیکھی جاسکتی ہے :

جب تک ظلم وجور ہے باقی

سرمائے کا دور ہے باقی

چقلیدار کرنا ہوگا

جینا ہے تو لڑنا ہوگا

بغاوت

اُردو شاعری میں بغاوت استعارہ ہے پرانی روایات کے توڑنے کے عزم کا بغاوت استعارہ ہے نئے جہان نئ دنیاؤں کی تخلیق کا۔ اُردو شاعری میں اس روح کے ساتھ بغاوت غالب کے توسط سے آئی۔ حالی ، مجید امجد اور ن م راشد سے ہوتی ہوئی خسروتک چلی آتی ہے۔ شاعر چونکہ ایک روح سلیم اور وسیع مشاہدہ رکھنے والا شخص ہوتا ہے۔ اس لیے وہ اپنے اردگر در دنما ہونے والے واقعات و حوادث کا اثر دوسرے افراد سے زیادہ شدت سے قبول کرتا ہے اور اُس کے شفاف آئینہ دل سے ٹکرا کر دو گنا شدت سے منعکس ہوتا ہے تو اس میں ذاتی واردات قلب اور شخصی تجربات اور دکھ شامل ہوتے ہیں تو بغاوت کی نقیب آواز بن کر چہار سو گونجنے لگتی ہے :

محنت کس نے کی اور محنت کا پھل کس نے کھایا

ہم نے کب بویا تھا مالک جو کچھ ہم نے پایا

دھرت پھٹی نہ آسمانوں سے اُتری کوئی نشانی

تیری ذات پہ شک سا گزرا دیکھی عجب کہانی

رب کے ساتھ گستاخی کا یہ موضوع نہیں ہے بلکہ اقبال کے ہاں یہ زیادہ شدت سے نظر آتا ہے ۔ لیکن خسرو کی اس گستاخی میں اُس بچہ کی سی معصومیت اور لگا و نظر آتا ہے جو کسی چیز کے نہ ملنے پر اپنی ماں سے ناراض ہوتا ہے ضد کرتا ہے اور روتے روتے پھر اُسی ماں کی آغوش میں پناہ لیتا ہے۔ فضل احمد خسرو گستاخی کو عزم میں بدلنے کا ہنر جانتا ہے۔ وہ نا امید ہونا نہیں جانتا :

بے تعلق سا ہے مگر پھر بھی
مجھ سے وہ بے خبر نہیں لگتا

بے تعلق تعلق سا ترقی پسند تحریک نے جہاں ایک طرف اُردو نظم کو نئے افق اور نئے زاویے عطا کیے وہیں اس میں ماضی کی روایات سے ناتا ٹوٹ جانے کی وجہ سے ایک طرح کی مایوسی اور نا امیدی بھی جنم لیتی ہے اور ایسا معاشرہ کے مروجہ اصول وضوابط سے انحراف کرنے والے میں زیادہ نظر آتا ہے۔ اور ایسے میں اس بات کے امکانات بہت زیادہ نظر آتے ہیں ۔ جب انسان کسی نظریئے کی نفی کرتا ہے۔ مگر اسے اپنی زندگی کو نئے سرے سے استوار کرنے کے لیے جس اخلاقی و مذ ہبی بنیاد کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ اس کے پاس نہ ہو۔ مثلاً ن م راشد اور مجید امجد کے ہاں ہمیں یہ مایوسی زیادہ تاریک اور بھیانک نظر آتی ہے مگر فضل احمد خسرو کے ہاں چونکہ ایک نظریاتی اساس موجود ہے اس لیے یہاں نا امیدی کی تاریک رات کے بعد ایک تابناک صبح کی درخشندگی نظر آتی ہے۔ خسرو کے نزدیک زندگی کسی ساکت و جامد عکس کا نام نہیں ہے بلکہ ایک متحرک و ارتقاء پذیر حقیقت کا نام ہے۔

خسرو کی نظموں میں مایوسی ، یاسیت اور جھنجھلاہٹ کا احساس بار بار پیدا ہوتا ہے۔شدید حالت اور حالات کو نہ بدل سکنے کی جھنجھلاہٹ ، مگر یہ احساس جلد ہی آزادی کی ایک بے پناہ لگن کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ ترقی پسند تحریک کے زیر اثر تمام تر شعراء اکرام میں ایک بات یہ نظر آتی ہے کہ وہ سابقہ کل سے کٹ کر ایک نئے کل مشترک کی تعمیر کرنے کے خواب بکتے ہیں۔ اور ایسا کرتے ہوئے وہ روایت شکن کہلوانے کے شوق میں اتنی دور نکل گئے کہ ماضی سے تعلق تو ڑ بیٹھے اور وہ چاشنی اور مٹھاس جو اردو شاعری کا طرہ امتیاز تھی ایک بے نام بے معنی کھر درے پن میں تبدیل ہو گئی مگر سر و یہ سارا کام اس چابک دستی سے کرتا ہے کہ بقول شخصے ہر چند کہیں کہ ہے نہیں ہے، کی مثال پیش کرتا نظر آتا ہے روایات کی عمارت جو ن۔م راشد اور مجید امجد کے ہاتھوں مسمار ہو چکی تھی اسے نئے ڈھنگ سے تعمیر فیض اور احمد ندیم اسکی جیسے شعراء نے کر دیا تھا۔ خسروئی تعمیر شدہ عمارت کی نوک پلک اس طرح سنوارتا ہے کہ اس میں شاندار ماضی کی تمام شان وشوکت پورے جلال سے نظر آتی ہے۔

علامات اور استعارات

ہر شاعر اپنی بات کو احسن طریقے سے کرنے کے لیے اور اپنے مضامین کو خوبصورتی سے رقم کرنے کو استعارات اور علامات کی ایک دنیا اپنے لیے پسند کرتا ہے۔ اور یہ استعارات اور علامات زندگی کے بارے میں اس کے عمومی رویے کے عکاس ہوتے ہیں۔ اس ضمن میں فرق یہ پڑتا ہے کہ عام شاعر پہلے سے مروج اور بنی بنائی زمین پر اکتفا کرتے ہیں مگر بڑے شاعر اپنی روایات سے اکتساب فیض کرنے کے باوجود ایک الگ جہان مصوری پیدا کرنے میں کامیاب ٹھہرتے ہیں ۔ بڑے شاعر کے ہاں علامات اور استعارات کا سارا نظام اس کی فکری جہت کے عین مطابق ہوتا ہے اور شاعر کی قوت خیال میں اضافہ کا باعث بن کر اسے اچھے شاعر سے عظیم شاعر بنانے میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ جب کہ عام شاعری پیش با افتادہ تراکیب و استعارات کے درمیان دم تو ڑ دیتی ہے ۔ قطع نظر اس کے کہ علامات واستعارات کا یہ نظام سیدھا سا ہے یا پیچیدہ ۔ یہ سب چیزیں شاعر کے خیال اور شاعری کے بنیادی مزاج کے مطابق جڑی ہوتی ہیں ۔جگنو اور کرن شروع ہی سے اُردو شاعری میں روشنی کی علامت رہے ہیں اور یہ اسی حوالے سے فضل احمد خسرو کی شاعری میں احمد خسرو کے بارے میں لکھتے ہیں :

مستعمل ہیں۔ عابد حسن منٹو شہر بے اذاں " کے دیباچے میں حصول

"اندھی کالی رات ہمارے عہد کے اس سماجی اور تہذ ہبی آشوب کا استعارہ ہے جو یوں تو کم و بیش ساری تیسری دنیا پر مسلط ہے پر ہمارے ہاں اپنے وطن میں آزادی کی منزل پر پہنچنے کے بعد بھی ہمارا مقدر بنی ہوئی ہے۔ آزادی سے پہلے اس کالی اندھی رات کا حوالہ غیر ملکی سامراج کا تسلط تھا ،

سامراج جس کا مقصد ہی اپنی نو آبادیات کو پسماندہ اور محکوم رکھنا تھا تا کہ یہاں کے وسائل کا استعمال کیا جائے اور یہاں کی افرادی قوت کو اپنی سلطنت کو دوام بخشنے کے لیے استعمال کیا جائے چنانچہ جد و جہد آزادی کا حقیقی مقصد سیاسی آزادی کے ذریعے نو آبادیاتی عہد کے معاشی اور سماجی نظام کو ختم کر کے خود مختار جمہوری اور ترقی یافتہ معاشرے کی تعمیر تھا۔ تا ہم یہ خواب پورا نہیں ہوا اور یہ اندھی کالی رات نئے اور پرانے حوالوں کے اشتراک سے چھلتی ہی رہی ۔ ۱۳

تھی وہ کالی رات جس سے آزادی پانے کی تڑپ ہر باشعور شخص کی طرح خسرو کےدل میں موجزن ہے اور جگنوایک جہد مسلسل اور سعی کی علامت بن کر اُس کی نظموں میں جلوہ گر ہے :

آسمانوں چھاگئےتارے
اور آہوں کی آگ ہے ان کی
جگنوؤں
کا جمال بھی گویا
رات بھر جو لڑے اندھیروں سے
بن کے سچائیوں کا سندیسا

فضل احمد خسر وزندگی کا شاعر ہے وہ اپنے ماحول میں سانس لیتا ہے اس طرح اُس کی شاعری میں پائے جانے والے استعارے اور علامتیں عام زندگی سے تعلق رکھتی ہیں۔ وہ اپنی شاعری کے استعارے کسی ماورائی دنیا سے نہیں لیتا بلکہ اسی دھرتی سےاخذ کرتا ہے۔ اُس کے ہاں چڑیاں اور برگد کا درخت استعارہ ہے ہماریروایات اور سماج کے ٹوٹتے ہوئے رشتوں کا :

رات نے لے کے سرد انگڑائی
اپنے بازو افق میں پھیلائے
چھایا ماحول ظلمت کا
گہرے ہونے لگے سبھی سائے

یہاں چڑیاں، برگر ستارے آسمان، سورج یہ سب علامتیں زندگی کی علامتیں ہیں اور زندہ نفوس کی طرح خسرو کی شاعری میں سانس لیتی نظر آتی ہیں۔ فضل احمد خسرو کے ہاں برگد مختلف پہلوؤں سے اثر انداز ہوتاہے۔ جلتی دھوپ میں سائے کی شفقت عطا کرتاہے۔ وہ بھوکے پرندوں کے لیے جہاں ایک چھاؤں ہے وہاں اُس کے پھل آتش حکم بجھانے میں اہم کردار ادا کرتے کبھی وہ دوست بن جاتا ہے اور کبھی محبوب اور دستگیر بن جاتا ہے۔ اس طرح فضل احمد خسرو خود بھی اس دھرتی سے اپنا تعلق استوار رکھتا ہے اور دوسری طرف آسمان سے ہم کلامی بھی چاہتا ہے۔ خسرو کی شاعری کے برگد میں ہمیں صوفیائے کرام کے لہجے کی خوشبو اور رنگ دکھائی دیتا ہے۔ جو دکھی انسانیت کو اپنے سائے میں لینے کے لیے ہمہ وقت باز و پھیلائے کھڑار بہتا ہے۔ جوخود موسم کے گرم و سرد کا شکار نظر آتا ہے مگر تھکے ماندے مسافر زندگی کی تپش سے اکتا کر اُس کے نیچے ہی پناہ لیتے ہیں۔

آفاقیت

خسر وانسانیت کو وطن کی لکیروں کے پیچھے قید کرنے کا حامی نہیں ہے۔ وہ انسان کو محض انسان کی نظر سے دیکھتا ہےجس کے دکھ سکھ ، آدرش اور محرومیاں سب مشترک ہیں۔ خسرو دنیا کے کسی بھی حصہ میں تڑپتے ہوئے انسان کے دکھ پر تڑپ اٹھتا ہے :

اتنی تقسیم کیوں ہے بندوں میں
سب کوانسان کردیاہوتا

موسیقیت

یہ ہی بات خسرو اپنی نظموں روشنی کی رسول ہیں چڑیاں اور موۃ قبل انت موۃ میں کہتے دکھائی دیتے ہیں۔ خسرو کی شاعری چاہے وہ غزل کی ہو یا ظم کی موسیقیت سے بھر پور ہے ۔ وہ مترنم بحور کے ساتھ جملوں اور الفاظ کو خاص طریقہ سے استعمال کرتا ہے۔ خسرو فارسی اور ہندی الفاظ کو ایک خاص ڈھنگ میں استعمال کرنے کا ہنر خوب جانتے میں اور اس طرح اُن کی شاعری اُسی آفاقی موسقیت سے ہم آہنگ نظر آتی ہے جو کائنات میں جاری وساری ہے وہ خاص آہنگ جو زندگی کا استعارہ ہے۔ موسیقیت کے حوالہ سے خسرو کی نظم " بھگت سنگھ ہیں۔

حقیقت پسندی

شاعری کا کام تنقید حیات کی بجائے کشف حقیقت ہے اور حقیقت سے مراد نیکی اورروشنی کی اقدار ہیں ۔ یہ حقیقت انسان کے وجود میں ظاہر ہوتی ہے اور دوسرے انسانوں کے ساتھ مل کر دنیا کی شکل بدلنے کی سعی کرتی ہے کشف حقیقت کا فر سرانجام دینے کی کوشش میں شاعری در اصل آنے والے زمانے کے خدو خال واضح کرنے کا فرض انجام دیتی ہے۔ اگر حقیقت کا کام کسی بچے کی غیر ملوث آنکھوں کی مدد سے لیا جائے تو شاعری جس دنیا کی تصویر پیش کرے گی وہ ہر لحاظ سے اچھی اور بہتر ہوگی۔ فضل احمد خسر وایسا ہی کرتا ہے وہ لفظوں کی مدد سے ایک ایسا شعری عکس پیدا کرتا نظر آتا ہے جو پیدا تو حال میں ہوا ہے مگر اس میں ہمیں مستقل کے چہرے کی جھلک صاف نظر آتی ہے۔ ایسا مستقبل جو نیکی اور روشنی سے مرتب ہوتا ہے۔

جب بلالے گا مجھے بھی آسمان
بن کے جھمکوں گا ستارا دیکھنا

غزل کی طرح نظم میں بھی فضل احمد خسرو کی حقیقت پسندی دیکھتے چلئے :

تصوف

اُردو ادب میں تصوف کےاثرات کی نوعیت کافی متنوع اور دل چسپ ہے۔ عوام میں تصوف ایک دینی اور خالص اسلامی تزکیہ نفس کے طریقے کی شکل میں زیادہ عام نہیں ہوا عام طور پر اسے شریعت سے الگ اور مستقل بالذات نظام فکر سمجھا گیا۔ اس ادارے کی چند خصوصیات تھیں یہاں ظاہر پرستی کی قدر نہ تھی ۔ قانون جرم وسزا اور مذہبی تعصب کے بجائے باطن کی تطہیر اورتربیت پر زور دیا جاتا تھا محبت چاہیے وہ مجازی ہو یا حقیقی یہاں کی عبادت تھی ۔ انسان سے محبت خالصتا انسان ہونے کے ناطے کی جاتی تھی اُن تمام کمزوریوں کے باوجو جو فی الزمانہ ادارہ تصوف میں راہ پا چکی ہیں۔ تصوف کی حیات آفرین روایات کو فراموش نہیں کرنا چاہیے۔ جو تحریک مادی آسودگی کو ٹھکرا کر نفس کشی اور ریاضت کی تعلیم دے۔ درباروں کے تعیش کے برخلاف عوام کے دکھ درد سے رشتے جوڑے، عیش و نشاط کی جگہ قربانی کرنے کا حوصلہ بخشے ۔ اس کے اثرات ادب پر بڑے دیر پا اور دور رس ہوتے ہیں۔ اسی طرح تصوف نے ہماری شاعری کی تشکیل کی اس تصوف کی روح سماجی احتجاج ہے۔ خسرو کے صوفیانہ رنگ کے بارے میں اقبال صلاح الدین صبح صدا کے دیباچے میں لکھتے ہیں"۔

اس مجموعے کی ایک دو غزلیں اپنی فضا اور آہنگ میں بلاشبہ متصوفانہ شباہت رکھتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں اور ان کا لہجہ بھی باقی سب غزلوں سے زیادہ شیریں اور نکھرا ہوا ہے جی چاہتا ہے انھیں بار بار پڑھا جائے کاش خسروا اپنی توجہ کارخ اس گاؤں کی طرف موڑ دے جو سچا بھی ہے اور سُچا بھی ۔ "۱۴

میں جسے ڈھونڈتا تھا عالم میں
وہ رگِ جاں کے پاس لگتا ہے
گر کوئی بھی ستم نہیں باقی
روز محشر حساب کیاہوگا

داخلیت خارجیت

داخلیت سے مراد کسی شخص کے اندرونی احساسات و جذبات ہیں اور اصطلاح میں شاعر کا ذاتی احساسات اور جذبات کا بیان ہے جبکہ بیرونی مشاہدہ اور معاملات کوبیان کرنے کا نام خارجیت ہے اب اس مفہوم میں یہ کہا تو جاسکتا ہے کہ شاعر کو ہر قسم کے تعصب سے پاک ہونا چاہیے مگر یہ بات شاید مورخ کے لیے آسان ہومگر شاعر جیسے حساس دل رکھنےوالے شخص کے لیے محال ہے کہ وہ ارد گرد پھیلے ہوئے دکھ درد سے مشائر نہ ہو اور دہلی اجڑنے پر نوحہ نہ لکھے یہ اندرونی دکھ دردکو چھپا کر صرف خوشیاں بانٹے اور کہہ نہ اُٹھے :

دل تو اپنا اداس ہے ناصر

شہر کیوں سائیں سائیں کرتا ہے

اسی رنگ میں خار جیت اور داخلیت فضل احمد خسرو کے آہنگ میں بھی پائی جاتی ہے اس کے دل کے زخم جب خوشبو دینے لگتے ہیں تو وہ بے اختیار پکار اٹھتا ہے :

برسا ساون سچا تو پھر شعر کہے

حشر ہواجو برپاتوبھر شعر کہے

چونکہ خسر وانسانوں کی اُس نچلی پرت سے تعلق رکھتا ہے جسے افتادگان خاک کہیں تو بے جانہ ہوگا ، یوں اُس کے دکھ در دآفاقی ہو جاتے ہیں ۔ وہ جب غربت پسماندگی اور جہالت کے بھوت کو چمن زار زندگی میں ناچتا دیکھتا ہے اور بھوک و غربت کی دیوی کی بھینٹ ایک باپ کو اپنی جوان بیٹی اور ایک ماں کواپنا شیر خوار بچہ چڑھاتے دیکھتا ہے تو اُسے اپنے صحن میں ناچتی بھوک کی ڈائن نظر آتی ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں داخلیت داخلیت اور خارجیت خار جیت نہیں رہتی ۔ بلکہ خسرو کے تخیل کی بھٹی میں تپ کر ایک بچے شعر کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ خسرو کی نظم مو کا قبل است موۃ اعلیٰ ترین مثال ہے :

موۃَ قَبْلَ اَنتَ موۃَ

مؤرخ وقت کی دہلیز پر حیراں کھڑا ہے

عجب منظر نظر کو کھا رہا ہے

سبھی الفاظ گونگے ہوگئے ہیں

ساعت میں اگی ہو گھاس جیسے

ہمکتی ، پلپلاتی سی کئی دلدوز چیچنیں

ساعت سے الجھ کر مرگئی ہیں

رومانویت

رومانویت کے مفہوم میں بہت اختلاف پایا جاتا ہے۔ ایک ڈھیلے ڈھالے انداز میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ ایک ایسا اسلوب اظہار ہے جس میں فکر کے مقابلے میں تخیل کی گرفت مضبوط ہو۔ رسم وروایات کی تقلید سے آزادی۔ ایسی ذہنی حالت جس میں انسان ایک خیالی دنیا بسا لیتا ہے اور اُس کی تکمیل کی آرزو کے تخم کو دل ہی دل میں سینچتا رہتا ہے۔ یہ آرزؤں کی خیالی دنیا ہے جسے واضح کرنے کے لیے روسو کے خط کا یہ اقتباس بہت اہمیت کاحامل ہے۔ میں اپنے خوابوں میں مگن رہتا ہوں آزادی سے فارغ البالی سے اس طرح کہ میرا دل تخیل کے گل گشت میں بے روک ٹوک پھرے میری انتہائی خوشی اسی میں ہے کہ میں بے غم پھرتا رہوں ۔ تنہا دور درختوں میں چٹانوں پر اسی طرح کی رومانویت خسرو کے کلام میں بھی نظر آتی ہے مگر زیادہ تہذیب یافتہ شکل میں ۔ اسی لیے یہ ایک شعوری واردات سے زیادہ شعوری مشق نظر آتی ہے ۔ جس میں پریشان خیالی نہیں ہے بلک

تخیل مکمل طور پر نوک پلک سنوارے نظر آتا ہے۔ اس طرح خسرو کے ہاں رومانویت اور حقیقت پسندی گلے ملتے نظر آتے ہیں۔ خسر و ماضی کو حال سے جدا کر کے دیکھنے کا حامی ہے بلکہ ماضی کے تجربات سے فائدہ اُٹھا کر مستقبل کے نئے امکانات پیدا کرتا نظر آتا ہے۔

صبح صدا کے دیباچے میں اقبال صلاح الدین خسرو کی رومانویت کے بارے میں لکھتے ہیں۔ :صبح صدا میں الفاظ اسلوب اظہار موضوعات مقصد اور تخیل کا تناسب بیشک خوبصورت شائستہ اور اثر آفرین ہے لیکن مجموعی طور پر دیکھا جائے تو اس مجموعے کے خوبصورت شعری پیکر کی رمز رومانویت میں نہاں نظرآتی ہے :

جب خوشبو کا گھر اجڑا تھا
ایک تمنا پھول ہوئی تھی
تیری یادوں کی خوشبو میں گم سم بیٹھا رہتا ہوں
جیسے پھولوں کی خوش محفل میں کانٹے شامل رہتے ہیں

فضل احمد سروکی نظم دوستی اس موضوع پر شاعرانہ کی گرفت کی وضاحت کرتی ہے :

دوستی
بڑا پوتر سا ایک جذبہ
بہت مقدس سا ایک رشتہ
عجیب بھی ہے
غریب بھی ہے
محبتوں کا امین بھی ہے
دلوں میں پلتا یقین بھی ہے
مری نفی ہے

خیال والفاظ کی یکجائی

نقادانِ فن اس بات پر متفق ہیں کہ اچھی شاعری چاہے وہ غزل کی صورت میں ہو یا نظم کی خیال والفاظ کے خوبصورت آہنگ سے وجود پاتی ہے۔ اگر خیال رفیع الشان ہے اور الفاظ گھٹا ہیں تو ایسا رفیع الشان خیال جن کی مدد سے پیش کیا جا رہا ہے ان الفاظ کی پستی خیال کو ڈبو دے گی۔ اگر خیال پست د پوچ ہے تو الفاظ بے شک کتنے ہی عمدہ اور اعلیٰ کیوں نہ ہوں خیال کو سر بلند نہیں کر سکتے ۔ اس لیے لازم ہے کہ جیسا خیال ہو اس کو بیان کرنے کے لیے الفاظ بھی ویسے ہی لائے ہے :

مائیں۔ خسرو کا کمال یہ ہے کہ ان کے ہاں الفاظ و خیال کی یکجائی ملتی ہے۔ ان کے کلام میں جیسا خیال ہے الفاظ بھی ویسے ہی استعمال کیے ہیں ۔ فضل احمد خسرو کی نظم" ز میں کروٹ بدلتی ہے تو پھر منظر بدلتا ہے۔ ہمارے اس خیال کو صحیح ثابت کرتی ہے۔

حوالہ جات

۱۔ سید عبداللہ ، ڈاکٹر اشارات تنقید، لاہور،سنگ میل پبلیکیشنز، ۲۰۰۰ء ص :۲۷"
۲۔ سیدعبداللہ، ڈاکٹر " اشارات تنقید ،لاہور، سنگ میل پبلیکیشنز ،۲۰۰۰ ء، ص :۵۷
۳۔ سید عبداللہ ، ڈاکٹر ، اشارات تنقید، لاہور، سنگ میل پبلیکیشنز ،۲۰۰۰ ء ،ص:۶۱

۴۔ سید عبداللہ ، ڈاکٹر '' اشارات تنقید ،لاہور، سنگ میل پبلیکیشنز ، ۲۰۰۰ ء ،ص:۱۸۳
۵۔ سید عبداللہ، ڈاکٹر '' اشارات تنقید، لاہور، سنگ میل پبلیکیشنز ،۲۰۰۰ء، ص:۲۱۲
۶۔ سید عبداللہ، ڈاکٹر اشارات تنقید، لاہور، سنگ میل پبلیکیشنز ،۲۰۰۰ء ، ص: ۲۱۳
۷۔ سید عبداللہ ، ڈاکٹر اشارات تنقید، لاہور، سنگ میل پبلیکیشنز ،۲۰۰۰ ء،ص:۲۱۳
۸۔ سید عبداللہ ، ڈاکٹر '' اشارات تنقید، لاہور، سنگ میل پبلیکیشنز ،۲۰۰۰ ء ،ص:۸۱
۹۔ سید عبداللہ ، ڈاکٹر اشارات تنقید ، لاہور، سنگ میل پبلیکیشنز ،۲۰۰۰ ء ،ص :۹۰
۱۰۔ سید عبداللہ ، ڈاکٹر '' اشارات تنقید، لاہور، سنگ میل پبلیکیشنز ،۲۰۰۰ء ، ص : ۹۰،
۱۱۔ سید عبداللہ ، ڈاکٹر اشارات تنقید، لاہور، سنگ میل پبلیکیشنز،۲۰۰۰ ء ،ص:۷۲
۱۲۔ سید عبداللہ ، ڈاکٹر اشارات تنقید ،لاہور، سنگ میل پبلیکیشنز،۲۰۰۰ ء ،ص:۱۲۱ ،
۱۳۔ عابد حسن منٹو، دیباچہ ایک نیا طرز تغزل ، شہر بے اذاں ، اوکاڑا، لیبر فرنٹ ۲۰۰۶ء
۱۴۔ اقبال صلاح الدین تقریب دریافت ، دیباچہ صبح صدا